آگے بڑھے بغیر پیچھے ہی پیچھے سے سوویٹ روس کو چاروں شانے چت گرا دیا تھا اسی طرح سے کسی روز یہ مغربی دُنیا کو بھی پوپلے منہ کی ڈاڑھ کی طرح کھوچلا کر دینے والے تھے۔ اُنہوں نے فوراً فیکس بھیج کر کوٹ ودو کے لئے تین کثیر المقدار رقوم کی امدادیں منگوائیں جن میں سے ہر ایک ایڈ چالیس اُونٹوں پر لد کر آئی تھی اور کاغذی نوٹوں کے بجائے سونے کی اینٹوں پر مشتمل تھی۔ ایک امدادی رقم کوٹ ودو کے اندر پولیوشن دُور کرنے کے لئے تھی، دوسری اس گاؤں کی بڑھتی ہوئی آبادی کو روکنے کے لئے تھی اور تیسری کوٹ ودو کے نوجوانوں سے نشے کی لعنت دور کرنے کے لئے تھی۔ امریکی ماہرین نے چالیس دن کا چلہ کاٹ کر ان اعداد و شمار کی فوٹو کاپی ہر شخص کو فراہم کر دی تھی کہ کوٹ ودو کا ہر تیسرا شخص ہیروئن کا عادی ہے اور وہ ایک دن میں ایک سو چھپن روپے کی ہیروئن استعمال کرتا ہے۔

کوٹ ودو کا نمبردار کھلے میدان میں حیران پریشان کھڑا تھا اور اس کے سامنے خزانوں سے لدے چالیس چالیس اونٹوں کی تین قطاریں کھڑی تھیں۔ امریکی سفیر اسلام آباد سے اور سیکرٹری آف سٹیٹ واشنگٹن سے آ کر نمبردار کے دائیں بائیں کھڑے ہو گئے اور اس کے ارشاد کے منتظر تھے۔ نمبردار نے ترجمان کی طرف منہ کر کے پہلے تو اپنے معزز مہمانوں کا شکریہ ادا کیا اور پھر درد بھرے لہجے میں کہا "ان سے فرما دیجئے کہ ہمارا سارا گاؤں اُن کی توجہ، اُن کے تعلق اور ہمارے بارے میں اُن کے لطیف احساسات کا تہ دل سے شکر گزار ہے۔ سونے کی اینٹوں سے لدے ہوئے اونٹ جو انہوں نے ہماری مدد کے لئے عطا فرمائے ہیں، فی الحال ہماری کوئی مدد نہیں کر سکتے کہ کوٹ ودو میں پولیوشن نام کی کوئی چیز موجود نہیں۔ جب سے ہم نے اپنی بجلی پیدا کرنی شروع کر دی ہے، ہماری آنکھیں دھوئیں کو اور ہمارے سانس گرد کو ترس گئے ہیں۔ چند ماہ پہلے تک اماں صالحہ کے تنور اور مائی بھڑبھونجن کی بھٹی سے دھوئیں کے کچھ آثار نظر آجاتے تھے لیکن اب اُنہوں نے بھی بجلی کی بھٹیاں لگا لی ہیں۔ جگہ جگہ ٹیوب ویل لگ جانے سے سبزی اور سرسبزی گھروں کے اندر تک پھیل گئی ہے اور دھول کے تمام آثار مٹ گئے ہیں۔ چار پانچ روز پہلے لڑکے لڑکیاں مکئی کے کچھ بھٹے جمع کر کے چوک میں لے آئے تھے لیکن اُنہیں بھوننے کے لئے ان کے پاس آگ نہیں تھی۔

شرفو ڈرائیور بڑی وین لے کر شہر گیا اور وہاں سے ایک کلو کوئلے لے کر آیا۔ وہ کوئلے چوک میں دہکائے گئے تو سارا گاؤں باہر نکل آیا اور ایک دوسرے کو دھکے دے دے کر کاربن مونو آکسائیڈ کا آدھا آدھا گھونٹ نتھنوں میں کھینچ کر مشکل سے پرانی پولیوشن کی یاد تازہ کر سکا۔ ان کوئلوں سے بڑی مشکل کے ساتھ تین بھٹے بھونے جا سکے ..... چنانچہ میں درخواست گزار ہوں کہ پولیوشن کی کم یابی بلکہ نایابی کی وجہ سے یہ امداد واپس لے لی جائے۔ آپ کا بہت بہت شکریہ۔"

گاؤں کے لوگوں نے زور زور سے تالیاں بجائیں اور لڑکوں نے منہ میں اُنگلیاں ڈال کر سیٹیوں کا بازار گرم کر دیا۔ اماں رابیاں نے اپنی لاٹھی ہوا میں گھما کر کہا "وے منڈیو! مجھے سونے کی اینٹ ایک مرتبہ دکھا تو دو۔ میں نے تو آج تک دیکھی ہی نہیں۔ ایسے ہی ناں سارے اونٹ واپس کر دینا۔"

لڑکے موٹی موٹی تالیوں کی تھاپ میں "اچھا اماں! سوہنی اماں! ربیاں اماں! صہباں اماں!" گانے لگے اور نمبردار نے اپنے ہاتھ اُوپر اُٹھا دیئے! پھر وہ کہنے لگا "ہمارے کوٹ کی آبادی تو پہلے ہی بہت کم ہے۔ گامے لوہار کے پچھلے دس سال سے بچی بچہ نہیں ہوا۔ سارے بہن بھائی ہاتھ اٹھا کر دعا کرو اللہ اس کا گھر آباد کرے۔ جو بی بیاں کوٹ وود چھوڑ کر اپنے سسرال چلی گئی ہیں، ان کی جگہیں بھی ویسی ہی خالی پڑی ہیں۔ بڑے بزرگ باسٹھ سال تک زندہ رہنے کی دعا کرتے ہیں اور خدا ان کی دعائیں قبول کر لیتا ہے۔ ان کی جگہیں بھی خالی ہو جاتی ہیں۔ ہم کو تو اپنے کوٹ میں جانوں کی اور انسانوں کی پہلے سے بھی زیادہ ضرورت ہے کہ جتنے لوگ ہوں گے، اسی قدر بجلی کی پیداوار میں اضافہ ہو گا۔۔۔ چنانچہ اونٹوں کی دوسری قطار کے خزانوں کی بھی ہمیں ضرورت نہیں۔ اس دعا کی البتہ ضرورت ہے کہ اللہ ہر گھر میں نکے نیانے کا بوٹا لگائے اور کوٹ وود کی پھل پھلواری سلامت رکھے۔"

اونٹوں کی دوسری قطار کے ساربان نے حیرت سے نمبردار کو دیکھا اور آپس میں سرجوڑ کر کہا "احمق ہے کیا؟"

پھر نمبردار بولا "ہم محبت کے مارے لوگ ہیں اور صرف محبت کے نشے میں ہی زندہ ہیں اور کسی دوسرے نشے کا ہم کو حکم ہی نہیں۔ یہ اعداد و شمار ہمارے گاؤں یا

ہمارے ملک کے نہیں ہیں۔ یہ ہم کو شرمندہ، خوف زدہ کرنے اور ایک دوسرے کی نظروں میں ذلیل کرنے کے لئے بنائے جاتے ہیں اور ہماری عزت نفس کم کرنے کے لئے ہمیں سنائے جاتے ہیں، ورنہ ایسی کوئی بات نہیں کہ خدانخواستہ ہمارے یہاں کا ہر تیسرا آدمی ہیروئن کا نشئی ہو۔ ایک لڑکا ہمارا یونس نامی ضرور ایسا تھا جس نے ہالینڈ جا کر پہلی مرتبہ ہیروئن کا نشہ کیا تھا اور پھر وہاں کے لڑکوں سے مل کر باقاعدہ پی پینے لگا تھا۔ ہم نے دو مرتبہ اپنا آدمی اسے لینے کے لئے بھیجا بھی مگر وہ آیا نہیں۔ اب وہ وہاں روتا ہے اور ہم یہاں روتے ہیں۔ نہ ولایت والوں نے ہیروئن کا مسالا بنایا ہوتا نہ ہمارا یونس ہم سے جدا ہوتا۔ اب چالیس اونٹوں پر سونے کی اینٹوں کے صندوق لے کر ہم کیا کریں گے جب ہمارا یونس ہی ہمارے درمیان نہ رہا!"

لڑکے اور لڑکیوں نے بڑی دردناک آواز میں گانا شروع کر دیا "آ یونسا تینوں اکھیاں اڈیک دیاں!"

پھر نمبردار آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا اندر سکول کی طرف چلا گیا۔ اس کے ساتھ گاؤں کے دوسرے لوگ بھی سر جھکائے میدان سے نکل کر بستی کی طرف جانے شروع ہو گئے اور کھلے میدان میں چالیس چالیس اونٹوں کی تین قطاریں، ان کے ساربان اور امریکی سفیر اور سیکرٹری آف سٹیٹ کھڑے رہ گئے۔

جاپانی انجینئر جب بھی اس بجلی گھر کا معائنہ کرنے آتے، وہ اس پراجیکٹ کے اقتصادی فوائد کی تفصیلات تیار کرنے لگتے۔ وہ اس بجلی گھر کا تخمینہ ین میں لگاتے، پھر اس کو امریکی ڈالروں میں منتقل کرتے، امریکی ڈالروں کے پاکستانی روپے بناتے اور پاکستانی روپوؤں کو ڈوئش مارک میں بدل کر دیکھتے کہ اگر جرمن اس اختراع کا راز جان جائیں اور وہ ایسے بجلی گھروں کی تعمیر پر حاوی ہو جائیں تو ڈوئش مارک کے مقابلے میں ین کتنا گر جائے گا اور اقتصادی منڈی کی بساط پر جاپان کا مہرہ کون سے خانے میں پہنچ جائے گا!

انگریز وفد اس حیرت انگیز کارنامے کو دیکھنے جب بھی آتا، وہ اپنے ساتھ انڈیا آفس لائبریری سے پرانے گزٹیئر کی وہ کاپیاں ضرور لاتا جن میں کوٹ ددو اور کوٹ ددو کے لوگوں کا ذکر تھا اور جس پر ڈپٹی کمشنر کورنتھ لانگ لاج نے اپنے ایم فل کے مقالے

کی بنیاد رکھی تھی۔

انگریز وفد مقامی لوگوں کو اس حقیقت کا اعتراف کرنے پر مجبور کرتا تھا کہ اس طرح کی بجلی کی پیداوار کا ڈپٹی کمشنر لانگ لاج نے اپنے ایک خط میں ذکر کیا تھا جو اس نے ڈی ایچ لارنس کو لکھا تھا اور جو ڈی ایچ لارنس اٹلی کے اٹرسکن کھنڈرات میں گرا آیا تھا۔ اب یہ خط سویڈن کے ایک ماہر آثار قدیمہ کو پورے سوا سو سال بعد یورال کی کھدائی میں ملا تھا جہاں ڈی ایچ لارنس کی ایک محبوبہ رہتی تھی اور جس نے توتیا کھا کر خودکشی کر لی تھی۔ اس خط میں اس بات کا وضاحت کے ساتھ ذکر تھا کہ کوٹ ودو دُنیا کا وہ واحد مقام ہے جہاں انسانوں کے درمیان تعلقات کی ایسی بے لوث گرم جوشی ہے کہ اس گرمی سے بجلی پیدا کی جا سکتی ہے اور اُس سے بڑے بڑے کام لئے جا سکتے ہیں.... لیکن ڈپٹی کمشنر کورنتھ لانگ لاج کی اندازے کی ایک ہی غلطی تھی کہ وہ اس بجلی کو سٹیٹک الیکٹرسٹی سمجھتا تھا حالانکہ اس میں ہائی پاور ٹینشن کی ساری خصوصیات موجود تھیں۔

جرمن انجینئر صرف اس بات میں دلچسپی رکھتے تھے کہ ان "جنریٹروں" کی نگہداشت کس طرح سے کی جاتی ہے اور اُن کی مینٹی نینس کا کیا بندوبست ہے۔ اُن کا خیال تھا کہ آگے چل کر جب ان مشینوں کی ڈپری سی ایشن ہو گی تو پھر یہاں کے لوگ کیا کریں گے اور اگلے منصوبے کس بنیاد پر استوار کریں گے!

ایس ڈی او رضوان نے جرمن سائنس دانوں کو بتایا کہ ہم ہر جمعرات کی شام کو اپنی مشینوں کی سروس کرتے ہیں اور اُن کو نئے سرے سے نئی زندگی عطا کر کے بالکل ری کنڈیشن کر لیتے ہیں۔ جوں جوں یہ ری کنڈیشن ہوتی جاتی ہیں، ان کی ہیئت پہلے کے مقابلے میں بہتر ہو جاتی ہے اور یہ بتدریج مضبوط تر ہوتی جاتی ہیں۔

جرمن وفد جمعرات تک کے لئے رک گیا۔

جمعرات آئی اور مغرب کی نماز کے بعد حیاتو کے باڑے کے کھلے صحن میں لوگ آہستہ آہستہ آ کر جمع ہونے لگے۔ ایک طرف نوجوانوں اور مردوں کا گروہ بیٹھ گیا اور اُن کے میمنہ اور میسرہ کو بزرگوں نے ڈھانپ لیا۔ دوسری جانب ٹھیک دو گز کے فاصلے پر گاؤں کی عورتیں رنگ برنگے کپڑے پہنے، ہار سنگھار کئے ایک دوسری کے ساتھ

اٹھکیلیاں کرتیں، دائرے بنا کر دریوں پر بیٹھ گئیں۔ مولوی صاحب نے بہ آواز بلند تین مرتبہ درود شریف پڑھا اور پھر عورتوں نے "یاودودو، یا ودودو، یاودودو!" کا ورد دھیمی آواز میں شروع کر دیا۔ اُن کی دھیمی آواز کو اُجالنے کے لئے مردوں نے اُونچی آواز میں یہی ورد اُٹھایا اور سارے میں گونج کا ایک چبوترہ سا اٹھنے لگا۔ ایک ردا عورتیں لگاتیں، دوسرا ردا مرد لگاتے اور میمنہ میسرہ پر بیٹھے ہوئے بزرگ اسی ورد سے جلدی جلدی چونہ ٹیپ کر کے ایک طرف ہو جاتے۔ پھر ایک نیا ردا لگتا، اس پر دوسرا ردا اٹھتا اور ورد کا چبوترا تھوڑا سا اور بلند ہو جاتا۔

نوجوان ورد بھی کرتے جاتے تھے اور گردنیں اُٹھا اُٹھا کر اپنی محبوباؤں کو بھی دیکھ رہے تھے جو موتیوں بھری شربتی اور نیلی آنکھوں کی کھول بند کے پیچھے نہائی دھوئی نروان کی سیڑھیاں طے کر رہی تھیں۔

جرمن سائنس دان محسوس کر رہے تھے کہ یہ کوئی انوکھی ٹیکنالوجی ہے جس کے زور پر چلتی ہوئی مشینوں کی سروس ساتھ ساتھ کی جا سکتی ہے۔ اُنہوں نے بڑی محبت سے تیار کئے ہوئے بلیو پرنٹوں کو اب تہ کر کر کے کوٹ کی اندرونی جیبوں میں رکھنا شروع کر دیا تھا اور ایسے جنریٹر ورلڈ مارکیٹ میں سپلائی کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔

جب سے کوٹ ودو میں یہ انوکھا بجلی گھر قائم ہوا تھا یہاں کے مردوں کی راجپوتی شان، پٹھانی غصہ اور برہمنی نفرت بالکل ہی ختم ہو گئی تھی۔ مرد اپنے گھروں میں داخل ہونے سے پہلے زور سے کھنکھارتے، تالی بجا کر خیالی کبوتروں کو اُڑاتے اور پھر کوئی بولی ٹپہ گاتے ہوئے گھر کے اندر داخل ہونے کے بجائے گلی میں آگے کو نکل جاتے۔ وہ ان گپی، لطیفے باز اور ٹھٹھولیے نوجوانوں کو وہاں سے کھسک جانے کا ٹائم دیتے تھے جو اُن کی غیر موجودگی میں گھر کی عورتوں سے گپیں لڑانے آ جاتے تھے۔

کوٹ ودو میں ہر شخص کی اپنی اپنی جائیداد، اپنا اپنا گھر اور اپنی اپنی دوکان کے ساتھ اپنی اپنی آڑھت تھی۔ کوئی شخص کسی کی ملکیت میں خواہ مخواہ کا حصہ نہیں بٹا سکتا تھا۔ پرسنل پراپرٹی کے حقوق بہت سخت تھے لیکن کھانے پینے کی اشیا پر کسی کی اجارہ داری نہیں تھی۔ لڑکے سکول کو جاتے ہوئے، ہالی کھیتوں سے آتے ہوئے اور لڑکیاں گلی محلے صاف کرتے ہوئے کسی بھی گھر میں داخل ہو کر اپنی بھوک پیاس مٹا سکتے تھے

اور کوئی شے پسند آنے پر کٹوری میں تھوڑی سی نکال کر اپنے گھر میں لے جا سکتے تھے۔

اماں صوباں کی کاڑھنی کا دودھ اور بے بے نذیراں کی کڑھی سارے علاقے میں مشہور تھی۔ لوگ اپنی اپنی ضرورت اور اپنی اپنی خواہش کے مطابق دودھ کے کٹورے اور کڑھی کی رکابیاں بھر بھر کر لے جاتے اور بے بے اور اماں نئے سرے سے اپنے دیگچے چڑھا دیتیں۔ اس گاؤں کے باسی کھانے پینے کی چیزوں کو سب کی ساجھی سمجھتے تھے اور اُن میں کوئی شے کسی بھی شخص کی ذاتی ملکیت نہیں گردانی جاتی تھی۔

فراغت ہونے کی وجہ سے کوٹ ددو کے لوگوں میں کھیلوں کا چسکا اتنا بڑھ گیا تھا کہ سارا سارا دن نوجوان فٹ بال، ہاکی اور والی بال کھیلتے رہتے جبکہ بڑے چوسر، کیرم اور شطرنج کی پالیاں جمائے بیٹھے رہتے۔ لیکن ان کی گیمز کے رول بڑے عجیب تھے۔ آپ نہ تو مخالف ٹیم کو ہرا سکتے تھے اور نہ ہی دوسری پارٹی سے کوئی پوائنٹ جیت سکتے تھے۔

ہاکی، فٹ بال میں جب کوئی گول ہو جاتا تو دونوں ہی ٹیمیں بانہوں میں بانہیں ڈال کر بھنگڑا شروع کر دیتیں اور ساری فیلڈ کا چکر لگانے کے بعد پھر سے کھیلنا شروع کر دیتیں۔ والی بال میں گیند کو اوپر اٹھائے رکھنے کا کھیل ہوتا تھا اور ایک طرف کے کھلاڑی نٹ کے نیچے سے نکل کر دوسری فیلڈ میں داخل ہو جاتے تاکہ بال نیچے نہ گرنے پائے۔ ٹیمیں ایک دوسرے کے خلاف نہیں کھیلتی تھیں، بال کے خلاف کھیلتی تھیں۔ بال اور کشش ثقل مل کر انسانوں کو شکست دینا چاہتے تھے اور انسان اس کی مدافعت کرتے تھے۔ سات سات گھنٹے تک بال زمین پر نہیں گرتا تھا۔

اسی طرح بڑے بزرگ شطرنج میں شہ کو مات نہیں ہونے دیتے تھے۔ گھوڑا ڈھائی پٹ چل کر ادب سے کھڑا ہو جاتا تھا اور پیادہ سفلوں والی حرکتیں کر کے بادشاہ یا وزیر کو مات دینے کی کوشش کرتا تھا۔ کیرم کی ساری گوٹیاں ایک ہی رنگ کی ہوتی تھیں۔ جو جس کو پاکٹ کر لیتا، تالی بج جاتی۔ یہی چوسر کا حال تھا۔ نردیں بڑھتی ضرور تھیں لیکن پٹتی نہیں تھیں، محبت اور خلوص کے ساتھ ایک دوسری کے کندھے سے لگ کر کھڑی ہو جاتی تھیں۔

جب کینیڈا سے نیوکلیئر فزکس کے سائنس دانوں کی ایک ٹیم کوٹ ددو کے

عجیب و غریب بجلی گھر کا معائنہ کرنے آئی تو اس کے ساتھ ان کا ایک اپنا انٹرپریٹر بھی تھا۔ یہ انٹرپریٹر کوٹ ودو کے کمہاروں کا لڑکا موسیٰ تھا جو لڑکپن میں گھر سے بھاگ کر بحری جہاز پر سویپر لگ گیا تھا۔ پھر وہاں سے باورچیوں اور خلاصیوں کی ماریں کھاتا کھاتا امریکہ پہنچ گیا تھا۔ تین مختلف ریاستوں کے بڑے ہسپتالوں کی لانڈریوں میں مریضوں کی گندی چادریں دھو دھو کر جوان ہوا اور شام کی کلاسوں میں داخلہ لے کر یونیورسٹی کے دروازے تک جا پہنچا۔ سائڈ سٹیٹ فزکس میں ایم ایس سی کرنے کے بعد شکاگو یونیورسٹی میں فزکس کا لیکچرار مقرر ہوا۔ وہاں تین سال تک ڈاکٹریٹ کے مقالے پر کام کیا اور میک گل یونیورسٹی کینیڈا سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ پھر جس طرح اس کے آباؤ اجداد ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کوٹ ودو چھوڑ کر سندھ چلے گئے تھے، وہ بھی امریکا چھوڑ کر ٹورونٹو میں آباد ہو گیا۔ اب وہ کینیڈا کے نیوکلیئر فزکس کے سائنس دانوں کے ہمراہ ایک ماہر کی حیثیت سے آیا تھا اور اپنی ٹیم کے لیے انٹرپریٹر کے فرائض بھی سرانجام دیتا تھا۔

جتنے دن کینیڈین سائنس دانوں کی یہ ٹیم کوٹ ودو کے گرڈ سٹیشنوں کا مطالعہ کرتی رہی اور جگہ جگہ سے زمین کھدوا کر دیکھتی رہی، کوٹ ودو کے لوگ موسیٰ کو بھی گورا انگریز ہی سمجھتے رہے۔ سرخ و سفید رنگ، سنہری بال، سنہری عینک، سیاہ ٹائی اور گرے فلینل سوٹ..... وہ کسی طرف سے بھی دیسی آدمی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ انگریزی بھی ویسی ہی بولتا اور کھانا بھی انہی کے انداز میں کھاتا اور چھینک بھی ویسی ہی مارتا تھا۔

دراصل موسیٰ کے ننھیال کا تعلق سوہنی کمہارن کے قبیلے سے تھا اور اس کی پڑنانی بتایا کرتی تھی کہ اس نے اپنے لڑکپن میں سوہنی کو بہت قریب سے دیکھا تھا اور سوہنی کی والدہ سے قرآن پڑھا تھا۔ بغدادی قاعدہ ختم کرنے کے بعد موسیٰ کی پڑنانی سوہنی کے گھر میں ہی آ گئی تھی اور اس نے سوہنی باجی کو پیڑھی پر بیٹھ کر اپنے پیر دھوتے، مسی ملتے، سرمہ لگاتے اور بال بناتے دیکھا تھا۔ دراصل ان کے جوبن کے نشان ان کے بھرے بھرے کندھوں سے ہی شروع ہو جاتے تھے جن پر ٹوکہ بھر سنہری ریشمی بال ببر شیر کے نوزائیدہ بچوں کی طرح لہلہاتے رہتے۔ وہ اپنی گوری رنگت اور سنہرے بالوں سے بڑی تنگ تھی اس لیے سب سے زیادہ انہی کا خیال رکھتی تھی اور

انہی سے محبت کرتی تھی!

گاؤں کے تینوں گرڈ سٹیشنوں کے اردگرد اور عین وسط میں چار چار فٹ گہری کھائی کھودنے کے باوجود جب کینیڈین سائنس دانوں کو بجلی پیدا ہونے کا اصل راز معلوم نہ ہو سکا تو انہوں نے واپس جانے کی ٹھانی اور نمبردار کو اپنے ارادے سے آگاہ کر دیا۔

کینیڈین سائنس دانوں کی ٹیم کی روانگی سے پہلے نمبردار نے ایک الوداعی جلسے کا اہتمام کیا جس کے مہمان خصوصی ایس ڈی او رضوان اور صاحب صدر سائنسی ٹیم کے سربراہ تھے۔ جلسہ گاہ میں کوٹ ددو کے مرد عورتیں، بچے بوڑھے، امیر غریب سبھی موجود تھے۔ سامنے والا گاؤں روالیاں، جسے کوٹ ددو چار سو چالیس وولٹ بجلی سپلائی کرتا تھا، اپنے سارے معززین کے ہمراہ پنڈال میں موجود تھا۔ حیدر والا اور موضع گلو کے چودھری بھی آئے ہوئے تھے کہ ان کو تازہ تازہ گھریلو بجلی کی سپلائی لائن ملی تھی اور وہ ہائی ٹینشن وائر ڈال کر چار سو چالیس کی سپلائی کے درخواست گزار بھی تھے۔

جب کمہاروں کے بیٹے ڈاکٹر موسیٰ نے سٹیج پر آ کر "السلام علیکم" کہا تو ایک گورے کے منہ سے یہ کلمہ سن کر سارا جلسہ تالیوں کی گونج میں ڈوب گیا۔ ڈاکٹر موسیٰ نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر بڑی مشکل سے تالیوں کا یہ سلسلہ رکوایا اور اپنی خوبصورت گونج دار آواز میں کہا "میرے عزیز ہم وطنو اور پیارے گرانیوٗ!" لیکن پیشتر اس کے کہ وہ اپنا فقرہ مکمل کرتا، سارے لوگ پنڈال میں اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور انہوں نے جھپ تال پر تالیاں بجانا شروع کر دیں اور ساتھ گانا شروع کر دیا "رک جاوے ہانیاں، رہ جاوے ہانیاں!" —

ڈاکٹر موسیٰ نے دس بارہ منٹ تک مسلسل ہاتھ اٹھا اٹھا کر اور واسطے دے دے کر لوگوں کو خاموش کرایا اور پھر ان کو اپنی اپنی جگہ پر بیٹھنے کی درخواست کی۔ جب مجمع اپنی جگہ پر بیٹھا اور بیٹھے ہوئے لوگوں کے درمیان آپس کی بھنبھناہٹ ختم ہوئی تو ڈاکٹر موسیٰ نے ایڑیاں اوپر اٹھا کر بڑی گرم جوشی سے کہا "میرے پیارے بھائیو اور بہنو! میرا نام موسیٰ ہے اور میں آپ ہی کے گاؤں کا ایک فرزند ہوں۔ میرے والد جیا کمہار اور میرے تایا دونو کمہار اسی مقام پر آپ کے لیے برتن بنایا کرتے تھے اور یہیں آوی

چڑھایا کرتے تھے۔"

لوگوں نے تالیاں بجاتے ہوئے پھر اُٹھنے کی کوشش کی تو ڈاکٹر موسیٰ نے ہاتھ باندھ کر انہیں منع کر دیا اور جب لوگ خاموش ہو کر بیٹھ گئے تو ڈاکٹر موسیٰ نے کہا "میں تقریباً تیس سال بعد اپنے گاؤں واپس آیا ہوں، لیکن ایک اجنبی اور ایک غیر ملکی کی حیثیت سے۔ آج شام ہماری یہاں سے روانگی ہے اور پھر پتا نہیں قسمت یہاں دوبارہ لاتی بھی ہے یا نہیں"....

پھر تھوڑے سے وقفے کے بعد کہ سارے پنڈال میں مکمل سناٹا تھا، ڈاکٹر موسیٰ نے کہنا شروع کیا "ہم لوگ آپ کی محبت سے اور آپ کی مہمان نوازی سے بے حد متاثر ہو کر جا رہے ہیں اور ہمیں یقین ہے کہ ہمارا یہ تاثر بڑے سالوں تک اسی طرح سے قائم رہے گا۔ اس تاثر کو دائمی تقویت یہ عجوبہ روزگار بجلی گھر فراہم کرتا رہے گا جو آپ لوگوں نے کوئی تھیوری بنائے بغیر یہاں پر قائم کیا ہے۔ ہم لوگوں نے اپنی عقل، اپنے علم اور اپنی صدیوں کی پڑھائی اور مشاہدے کی بنا پر آپ کے بجلی گھر کو پرکھنے کی کوشش کی ہے لیکن ہماری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ ہم نے حساس ترین آلات کی مدد سے یہاں کی میگنیٹک فیلڈ کو آنکنے کی کوشش کی ہے لیکن ہمیں کچھ پکڑائی نہیں دیا۔ آپ نے جو کچھ ہمیں بتلایا اور سمجھایا ہے اور جو توجیہ مسٹر رضوان انجینئر نے پیش کی ہے، وہ سائنس کی کسی کتاب میں تو کیا سائنس کے کسی خواب میں بھی نہیں ملتی۔ پھر ہم نے کوانٹم تھیوری کے ہر مفروضے کو یہاں اپلائی کرنے کی کوشش کی ہے مگر اک خاص ایکوئشن کے بعد معاملہ رک جاتا ہے اور آخر تک نہیں پہنچتا۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ کوئی کاسمک راز ہے جس کی نہ تو اب تک کوئی تھیوری قائم ہو سکی ہے اور نہ ہی اُسے مفروضیات کے دائرے میں شامل کیا جا سکا ہے۔ یہ کچھ اور ہی ہے جس پر ہماری تحقیقات تو جاری رہیں گی لیکن فی الحال ہم نے اُسے ایک لاینحل حقیقت سمجھ کر اس کے سامنے اپنا سر جھکا دیا ہے۔"

اس کے بعد ڈاکٹر موسیٰ نے گھوم کر اپنے پیچھے بیٹھے ہوئے کینیڈین سائنس دانوں کے گروہ کو دیکھا ایس ڈی او رضوان پر ایک تنقیدی نظر ڈالی اور حاضرین کے جم غفیر کی طرف بازو پھیلا کر کہا "میرے عزیز ہم وطنو اور میرے گاؤں کے پرانے

ساتھیو! میں تمہیں اس لاثانی کامیابی پر کہ تمہارا شریک اس وقت ساری دُنیا میں اور کوئی نہیں، دل کی گہرائیوں سے مبارک باد پیش کرتا ہوں اور انسانیت کی اس عظیم خدمت پر آپ کو اپنی آنکھوں پر بٹھاتا ہوں..... لیکن، اور اس لیکن کے بعد میری عرضداشت آپ کے گہرے فکر اور عمیق سوچ کی متمنی ہے کہ آپ نے اپنے سارے انڈے ایک ہی ٹوکری میں ڈال دیئے ہیں اور اپنی طرز زندگی کو ایک ہی ڈگر پر ڈھال لیا ہے۔ آپ کا سارا معاشرہ ایک سائیڈ پر ہی جھول گیا ہے اور آپ لوگوں میں اختلاف کا تنوع اور فرق و تفاوت کی بوقلمونی ناپید ہو گئی ہے۔ اس وقت تو آپ کامیابی کے راکٹ پر اُوپر ہی اُوپر جا رہے ہیں اور ساری دُنیا آپ کو اپنی اپنی پگڑی سنبھال کر دیکھ رہی ہے لیکن وہ وقت دور نہیں جب آپ کو اختلاف کے سہارے اور تفاوت کی آڑ کی ضرورت پڑے گی اور اُس وقت آپ اپنے گروہ میں اپنے سے مختلف لوگوں اور اپنے مزاج سے اُلٹ خاندانوں کو تلاش کریں گے۔ اس وقت جب آپ کو اپنی بقا کے لئے تضاد اور مخالفت کی شدت سے ضرورت ہو گی اور آپ کے ٹھاٹھیں مارتے انسانی گروہ میں ایک بھی متضاد نفس یا ایک بھی اپوزیشن گروپ نہیں ہوگا تو آپ کے اندر ٹوٹ پھوٹ کا عمل خود سے جاری ہو جائے گا اور آپ سنبھالے سے نہیں سنبھل سکیں گے۔

آپ مجھ سے بہتر سمجھتے ہیں کہ زندگی ساری کی ساری پوزیٹو عمل نہیں، تمام کی تمام مثبت دھار نہیں۔ اس کے لئے نیگیٹو کا ہونا بھی اشد ضروری ہے اور اس کے اندر منفیانہ کانٹوں کا پھلنا بھی لازمی اور لابدی ہے۔ جب تک آپ کے یہاں منفی قوتیں بروئے کار نہیں آئیں گی، آپ کا یہ پوزیٹو پراجیکٹ تا دیر نہیں چل سکے گا۔ جب تک آپ کے اندر from within اپوزیشن جنم نہیں لے گی اور آپ کے اندر شیطنت کا عمل جاری نہیں ہو گا، آپ کے اس صحت مند سیب کو اندر ہی اندر کیڑا لگ جائے گا اور آپ اس کے زہر کے متحمل نہیں ہو سکیں گے۔" ڈاکٹر موسیٰ نے ذرا رک کر کہا "آپ کی زندگی کے لئے آپ کے اندر ہی سے ایک مخالف گروہ کے پیدا ہونے کی اشد ضرورت ہے۔"

ایس ڈی اور رضوان نے پہلے تو زور سے میز پر مکا مارا اور پھر اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

کینیڈین سائنس دانوں کا طائفہ حیرت کے ساتھ رضوان کا منہ تکنے لگا۔

ڈاکٹر موسیٰ نے پلٹ کر کہا "بہت ممکن ہے رضوان صاحب کو میری یہ بات ناگوار گزری ہو، لیکن میں حقیقت عرض کر رہا ہوں کہ خوبی کو آگے لے جانے کے لئے اس کے ساتھ خرابی کی بھی ویسی ہی ضرورت ہوتی ہے۔" پھر اُس نے مسکرا کر کہا "خدا کو بھی اپنا کارخانہ کامیابی کے ساتھ چلانے کے لئے ایک ابلیس کی ضرورت محسوس ہوئی.... اس ابلیس کی جس کو اس نے از خود ہر طرح کے اختیار سے نوازا اور اس کی من چاہی رعایتیں اس کے حوالے کیں۔"

ایس ڈی او رضوان نے اُونچی آواز میں کہا "آپ کا بہت بہت شکریہ اور آپ سب کی تشریف آوری کا ہم پر احسان!"

ڈاکٹر موسیٰ نے پلٹ کر ایک مرتبہ پھر معنی خیز نگاہوں سے رضوان ایس ڈی او کو دیکھا اور حاضرین کی طرف منہ کر کے اُونچی آواز میں بولا "معزز خواتین و حضرات! آپ سب لوگوں کی مشترکہ کاوش سے یوں بجلی پیدا کرنا ایک بہت بڑا فنومنا ہے۔ آپ سب لوگ تو پورے کے پورے ایک ہی یقین اور ایک ہی ایمان میں داخل ہو گئے ہیں لیکن یہ پرانا زمانہ نہیں، نبیوں کا عہد نہیں۔ آپ کو اپنی سلامتی اور اپنی بقا کے لئے رویے پر نظر ثانی کرنا ہو گی اور یکتائی کے اس عمل سے باہر نکلنا ہو گا۔ یہ سائنس اور ٹیکنالوجی کا دور ہے اور اس کے تقاضے پرانی قدروں کے ساتھ لگا نہیں کھاتے۔ آپ کا بہت بہت شکریہ ..... آپ کی محبت .... اور آپ کی مہربانی۔"

ایک اچانک جھٹکے کے ساتھ اپنی تقریر بند کر کے ڈاکٹر موسیٰ اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا اور لوگ کینیڈین سائنس دانوں کے وفد کو الوداع کہنے کے لئے تیاریاں کرنے لگے۔

وفد کے تحفے تحائف سے لدے جہاز کی روانگی کے ٹھیک تین روز بعد ریاضی ماسٹر منظور احمد اور پرشین ٹیچر اشتیاق حسین چارپائی پر اکڑوں بیٹھے دوپہر کا کھانا کھا رہے تھے تو ماسٹر منظور نے لقمہ منہ میں روک کر کہا "ویسے کہنے کو تو کیا کہنا لیکن ڈاکٹر موسیٰ کی بات دل میں اُترنے والی ضرور تھی۔"

ماسٹر اشتیاق نے حیرت سے اپنے ساتھی کی طرف دیکھا اور لقمہ اس کے گلے میں اٹک گیا۔

"میں یہ نہیں کہتا کہ ڈاکٹر موسیٰ سو فیصد درست کہہ رہا تھا" ماسٹر منظور نے روٹی کے ٹکڑے میں چھوٹے آلو کو پکڑتے ہوئے کہا "لیکن اس کی یہ بات بڑی قابل توجہ تھی کہ زندگی صرف پوزیٹو لہروں کے سہارے ہی نہیں گزرتی، اس کے لئے نیگیٹو گردابوں کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔"

ماسٹر اشتیاق اسی طرح ہکا بکا روٹی کا ایک ٹکڑا توڑ کر بیٹھا تھا اور ماسٹر منظور کا منہ تک رہا تھا اور ماسٹر منظور کہہ رہا تھا "ہے تو بری بات..... اور اس وقت میرا دل بھی زور سے دھڑکا کہ ہم سب من حیث المجموع پورے کے پورے ایک ہی یقین میں داخل ہو گئے ہیں اور سب نے ایک رُخ ہی اختیار کر لیا ہے، لیکن بات موسیٰ کمہار کی بھی درست تھی۔ آپس کی محبت کی گرم جوشی سے بجلی تو پیدا ہو سکتی ہے لیکن اس کی نگہداری، اس کے گذران اور اس کے بقا کے لئے نفرت، جھگڑے، جھمیلے اور باہمی مناقشت کی بھی بڑی ضرورت ہے۔ ہمیں منفی قدروں کو بالکل ہی نہیں چھوڑ دینا چاہیے اور مشکل وقت کے لئے ایک سہارا چھپا کے رکھ لینا چاہیے جیسے ہوائی جہاز کی ہر سیٹ کے نیچے ایک حفاظتی جیکٹ ہوتی ہے اور آبی جہاز کے ہینگروں پر بہت سی حفاظتی کشتیاں محفوظ ہوتی ہیں۔"

ماسٹر اشتیاق نے بے لطف ہو کر کہا "منظور صاحب! یہ باتیں تو کچھ ارتداد کی سی ہیں اور اُنہیں تشکیک نہیں کہا جا سکتا۔ مجھے کچھ یوں لگ رہا ہے جیسے ہم مرتد ہو گئے ہیں ..... کہنے والا اور سننے والا دونوں!"

ماسٹر منظور نے ہنس کر کہا "خیر ایسی تو کوئی بات نہیں خدانخواستہ..... البتہ تفکر اور تدبر کا حکم خدا کی طرف سے بھی امر کے صیغہ میں وارد ہوا ہے۔"

یہ گفتگو کرنے کے بعد دونوں دوست سکول کے لان میں آ کر کھڑے ہو گئے جہاں ماسٹر خرم مسیح ایزل کے پیچھے نیائیوں کی بیک گراؤنڈ میں پرانا بھٹہ پینٹ کر رہے تھے۔ ماسٹر خرم کو آئل پینٹنگ میں دو انعام مل چکے تھے..... ایک اسلام آباد میں اور دوسرا کوئٹہ کی نمائش میں۔ یہ پینٹنگ جو وہ اس وقت تیار کر رہے تھے، ایشین آئل پینٹنگز کمپی ٹیشن میں ٹوکیو جا رہی تھی اور سکول کے لڑکوں کو پختہ یقین تھا کہ ماسٹر صاحب انشاء اللہ یہ مقابلہ جیت جائیں گے۔

ماسٹر منظور اور ماسٹر اشتیاق کوئی گھنٹہ بھر تک ماسٹر خرم سے ان رنگوں کے بارے میں بحث کرتے رہے جو اس پینٹنگ میں استعمال ہو رہے تھے۔ ایک جگہ ماسٹر خرم مسیح نے سیپیاٹون پوچھ کر وہاں چھری کے ساتھ عنابی رنگ کے ٹچ دیئے جس سے منظر اور بھی دل کش ہو گیا لیکن کونے میں سروئین بلو پودے کو کاٹ کر وہ میڈوگرین رنگ لگانے پر مائل نہ ہوئے۔

ابھی تینوں ماسٹر بڑی گرم جوشی کے ساتھ رنگوں کی بحث میں اُلجھے ہوئے تھے کہ موضع روالیاں کا چکی مستری اپنا سکوٹر فل سپیڈ دوڑاتا اُن کے سامنے آ کر گرا سی پلاٹ پر قوس سی مارتا ہوا گھوم گیا۔ سکوٹر بھی گرا اور چکی مستری بھی لیکن کوئی نقصان نہیں ہوا۔ اس نے زمین سے اُٹھتے ہوئے ہکلا کر کہا "ماسٹر جی ہمارے علاقے میں وولٹیج پورے نہیں آ رہے۔ میری ایک موٹر جل گئی ہے۔"

ماسٹر منظور نے چڑ کر کہا "یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے مستری جی! ہماری بجلی فلکچوئیٹ نہیں کرتی، آپ اپنا وولٹ میٹر تبدیل کرائیں۔"

مستری نے بڑی عاجزی سے گھگھیا کر کہا "حضور آپ خود چل کر دیکھ لیں۔ اس وقت چار سو چالیس کے بجائے دو سو اسی آ رہی ہے۔"

ماسٹر خرم نے پلیٹ پر رنگ مکس کرتے ہوئے کہا "ناممکن" اور کینوس پر موٹی موٹی ہچکیاں سی ڈالنے لگا۔

مستری نے کہا "آپ میرے ساتھ چل کر خود دیکھ لیں۔ اگر جھوٹ نکلے تو جو چور کی سزا سو میری۔" پھر اس نے اُوندھے پڑے ہوئے سکوٹر کو سیدھا کرتے ہوئے کہا "خراد والوں نے بھی اپنا کام بند کر دیا ہے اور بڑا خرادیا موٹر سائیکل لے کر سیدھا ڈاک بنگلے گیا ہے تاکہ رضوان صاحب کو اطلاع دے سکے اور میں ادھر اسی لیے آ گیا ہوں کہ رضوان صاحب عام طور پر اس وقت ادھر کا چکر لگایا کرتے ہیں۔"

ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ سامنے خرادیے کی بڑی موٹر سائیکل پر رضوان صاحب آتے دکھائی دیئے۔ رضوان صاحب بڑے محتاط ڈرائیور تھے لیکن اس وقت وہ گھبرائے ہوئے اور بوکھلائے ہوئے سے نظر آ رہے تھے۔

موٹر سائیکل ہموار راستے پر اُونچی اُونچی پھدکیاں مار رہی تھی اور اس کے پیچھے

دھوئیں کی ایک دبیز لہر بھاگی آ رہی تھی جیسی کبھی کبھار جیٹ جہاز کی دم سے برآمد ہوتی دکھائی دیا کرتی ہے۔ اُنہوں نے موٹر سائیکل ماسٹر صاحبان کے پاس روکی، اُسے سٹینڈ پر لگانے کے بجائے ماسٹر اشتیاق صاحب کے حوالے کیا اور بھاگ کر سکول کی اُس محراب تلے چلے گئے جہاں گرڈ سٹیشن قائم کیا گیا تھا۔

وولٹ میٹر کے سامنے کھڑے ہو کر پہلے اُنہوں نے زور زور سے میٹر تھپتھپایا، پھر جیب سے رومال نکال کر اس کا شیشہ صاف کیا۔ مین سوئچ آف کر کے پھر جلدی سے اُٹھا کر آن کیا لیکن وولٹیج دو سو اسی ڈگری سے ایک درجہ بھی آگے نہ بڑھی۔ پھر اُنہوں نے جلدی جلدی چاروں فیوز چیک کئے اور ہر تار کو تسلی بخش حالت میں پا کر فکرمندی سے اپنا سر کھجانے لگے۔ پھر اسی طرح سر کھجاتے کھجاتے موٹر سائیکل ماسٹر اشتیاق کے ہاتھ سے جھپٹ کر حیاتو کے باڑے کی طرف روانہ ہو گئے۔

وہاں بجلی گھر کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد ایک مرتبہ پھر ماسٹر صاحبان کے پاس آ کر کھڑے ہو گئے۔ اُن کے چہرے پر مایوسی، وحشت، ناکامی اور جگ ہنسائی کے سائے منڈلا رہے تھے اور وہ ماسٹر صاحبان کی طرف منہ کر کے اپنے آپ سے کہہ رہے تھے "کہیں کوئی بہت بڑا ڈرین ہو گیا ہے جو مجھے سمجھ نہیں آ رہا ورنہ بستی کی سپلائی کا گراف دو سو بیس وولٹ سے گر کر ایک سو نوے بانوے کبھی نہ رہ جاتا۔ کہیں کوئی گھپلا ضرور ہوا ہے، کوئی غلطی ضرور ہوئی ہے۔"

پھر اُنہوں نے اپنے آپ کو مجتمع کر کے تینوں اُستادوں سے پوچھا "سکول میں کوئی ناخوشگوار واقعہ تو نہیں ہوا؟"

"ہرگز نہیں" تینوں اُستادوں نے یک زبان ہو کر کہا۔

"کسی اُستاد نے کسی بچے کو بدنی سزا تو نہیں دی؟"

"بالکل نہیں" ماسٹر منظور نے کہا۔

"اُستادوں کے درمیان کوئی جھگڑا، کوئی اختلاف، کوئی احتجاج؟"

"ہرگز نہیں، بالکل نہیں" ماسٹر خرم مسیح نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

"کوئی تبدیلی، کوئی استعفیٰ، کوئی ایڈورس رپورٹ؟"

"ہمارے سکول میں تو ایسا کچھ ہوتا ہی نہیں۔" ماسٹر اشتیاق نے کہا "ہمارا تو ایک گھرانہ ہے، ایک کنبہ ہے، ایک خانوادہ ہے۔"

"گاؤں میں کوئی قتل تو نہیں ہوا؟"

"نعوذ باللہ" تینوں استادوں نے ایک ساتھ کہا۔

"کسی کی زمین پر ناجائز قبضہ؟"

"ہرگز نہیں"

"کوئی طلاق، ظلم، زیادتی؟"

"بالکل نہیں"

"پھر وولٹیج کیوں گری اور پھر ایمپیرز کیوں گھٹتے جا رہے ہیں؟"

ایس ڈی او رضوان سر پکڑ کر کھڑے ہو گئے اور پھر بڑی دیر تک اسی طرح کھڑے رہے۔ اچانک وہ اپنی جگہ سپرنگ کی طرح اچھل کر پھر وولٹ میٹر کے سامنے جا کھڑے ہوئے۔ وولٹ میٹر بدستور دو سو اسی وولٹ دکھا رہا تھا۔ وہ سر جھکائے اپنے کھلے ہاتھ پر دائیں ہاتھ کے مکے مارتے واپس آ کر ماسٹر صاحبان کے پاس کھڑے ہو گئے۔

"کسی کے دل میں کچھ ایسا خیال آیا ہو ...." ایس ڈی او رضوان نے سوچتے ہوئے کہا "کہ جیسے یہ کام مشکل ہو..... ایک انہونی بات ہو.... ناقابل یقین ہو..... زیادہ دیر تک نہ چل سکتا ہو؟"

"اب دل کی باتیں تو خداوند ہی کو معلوم ہیں انجینئر صاحب!" ماسٹر خرم نے سنجیدگی سے کہا۔

"البتہ باہر ایسی کوئی بات نہیں ہوئی" ماسٹر اشتیاق نے ماسٹر خرم کو لقمہ دیا۔

"سکول میں کسی قسم کی دشمنی، نفرت، حسد یا جلن کا جذبہ تو نہیں پیدا ہو گیا؟ میرا مطلب ہے کوئی شکر رنجی، کوئی دل شکنی..... کوئی ان بن .....؟"

"بالکل ایسی کوئی بات نہیں" ماسٹر منظور نے کہا "ایسے جذبے تو ہمارے لاشعور میں بھی موجود نہیں، پھر شعوری طور پر ہم کسی کے خلاف نفرت کا کیسے اظہار کر سکتے ہیں!"

رضوان انجینئر نے تھوڑی دیر تک سوچنے کے بعد چہرہ اُوپر اُٹھا کر پوچھا "سکول

میں کوئی نیگیٹو قسم کی بات تو نہیں ہوئی؟ کوئی اُلٹی بات؟ کوئی اُوندھی ٹیڑھی اور ..... معکوس فکر کی بات؟ کوئی بے یقینی، بے اعتباری، کم قدری یا کم دلی کی بات؟ کوئی خوف کی، خطر کی یا بیم موج کی بات ....؟"

تینوں ماسٹر چپ چاپ کھڑے رہے۔

ایس ڈی او صاحب نے کہا "آپ کے طلبا کے یا اُن کے والدین کے یا آپ کے رفقائے کار کے ذہن میں یہ تو نہیں آ گیا کہ ہم میں کوئی کمی ہے یا ہم کم مایہ اور تہی دست لوگ ہیں..... کم قیمت اور کم فہم لوگوں کا گروہ ہیں اور ہمیں ترقی یافتہ قوموں کے فرمودات کے مطابق چلنا چاہیے اور اُن پر عمل کرنا چاہیے؟ ہم میں تھوڑی سی شیطنت بھی ہونی چاہیئے؟"

ماسٹر منظور نے دل ہی دل میں سوچا کہ آخر اس میں قباحت بھی کیا ہے۔ عمل چاہے کریں نہ کریں، اُن پر غور تو کرنا چاہیے۔ اگر کہیں سے کوئی اچھی بات مل رہی ہو تو اس کے جانچنے، تولنے اور آنکنے میں کیا حرج ہے؟ ایک ہی اعتقاد اور ایک ہی یقین میں پورے کے پورے داخل ہو کر اپنے پرکھوں کی طرح زندگی بسر کرنا بھی تو کوئی دانش مندی نہیں۔ جب تک فریش واٹرز اندر نہیں آئیں گے، زندگی بند ہو کر اور تنگ ہو کر بدبودار ہو جائے گی۔

ماسٹر صاحب اپنے دل میں ابھی یہ غور ہی کر رہے تھے کہ ہوسٹل کا ایک اتھلیٹ محراب کے قریب سے گزرتے ہوئے چلایا "وولٹیج اور نیچے گر گئی سر۔ ایک سو اسی سے ایک سو ساٹھ پر پہنچ گئی اور آہستہ آہستہ اور نیچے جا رہی ہے۔"

تینوں ماسٹر اور ایس ڈی او رضوان پاگلوں کی طرح اُدھر بھاگے اور وولٹ میٹر کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ اُن کے چہروں پر مایوسی کے سائے گرے کارڈ کے شیڈ بدل رہے تھے اور کوٹ وڈو پاور ہاؤس کے وولٹ تیزی سے گرتے جا رہے تھے!